© rasailojaraid.com



# ہند اسلامی تہذیب اور تصوّف

ڈاکٹر محمد مسعود عالم قاسمی

ہندوستان میں اسلام کی اشاعت اور اسلامی تہذیب و ثقافت کی ترویج جن حضرات کے ذریعہ ہوئی ان میں صوفیاء کرام کا ذکر نمایاں طور پر کیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندی مسلمانوں کی قابل لحاظ تعداد نے انہی صوفیاء کے ہاتھوں قبول اسلام کیا، اور ہندوستان کے بہت سے علاقوں میں انہی بزرگوں نے دین کی روشنی پھیلائی۔ چونکہ اشاعت دین کا ان کا اپنا انداز تھا اور لوگوں کی اصلاح و تربیت کا مخصوص طریقہ کار تھا، اس لیے انھوں نے جس تہذیب و ثقافت کو فروغ دیا۔ اس میں اس طریقہ خاص کا پورا اثر موجود ہے۔ چنانچہ ہندی مسلمانوں کے بہت سے افکار، خیالات، رسمیں اور رجحانات اسی طریقہ خاص کی مرہون منت ہیں۔ صوفیاء کرام کی مخلصانہ اور بے لوث خدمات کا اعتراف کرنے کے ساتھ ان کی خدمات کو قرآن و سنت اور مزاج شریعت کے آئینہ میں دیکھنا ضروری ہے، نیز مسلم سماج پر مرتب ہونے والے ان اثرات کو بھی اسی زاویہ نگاہ سے دیکھنا لازم ہے جو ارباب تصوف کے ذریعہ رونما ہوئے ہیں۔

## تصوف کی ابتداء

تصوف اپنی ابتداء اور اصل کے لحاظ سے اسلام کے ان روحانی احکام سے ماخوذ ہے جن کو تزکیہ، اخبات، احسان اور تطہیر وغیرہ کے الفاظ سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس کے اعمال اور اوراد و وظائف بھی زیادہ تر قرآن و حدیث سے ماخوذ ہیں اور بظاہر اس کا مقصد بھی اسی مشن کو تقویت پہونچانا ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کی جانب سے سونپا گیا تھا۔ ابتدا اسلام میں تصوف نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور نہ اس طرح کا کوئی



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



نظام پایا جاتا تھا، تزکیہ یا تربیتِ نفس قرآن وحدیث کی مجموعی تعلیم وتربیت کا ایک پہلو تھا جو دوسرے پہلوؤں سے مربوط اور منسلک تھا بعد میں اس نے ایک نظامِ فکر وعمل کی صورت اختیار کرلی اور اس نے بہت سی چیزوں کو اپنے اندر سمیٹ لیا۔ ڈاکٹر البرنصری نادر کے بقول "تصوف اپنی ابتداء میں دینی زندگی کی صورتوں میں سے ایک صورت تھی اسے افراد ہی اختیار کرتے تھے اور ان سے ان کے خاص اصحاب حاصل کرتے تھے پھر بتدریج یہ منظم تحریک اور مدرسہ بن گیا جس سے اولیاء بن کر نکلنے لگے اور اس کے قواعد اور رسوم بن گئے"[۱]

تصوف کی تاریخ کے دو نمایاں دور قرار دئے جاتے ہیں۔ پہلا ابتدائی عہد سے نویں صدی تک کا اور دوسرا نویں صدی کے بعد کا۔ پہلے دور میں تصوف محض میلانات ورجحانات پر مبنی تھا، اس کا کوئی نظام نہ تھا دوسرے دور میں اس نے الٰہیات کا اپنا نظام مرتب کرلیا اور اپنے خانقاہی طریقوں کی تنظیم کی۔ تصوف کو ایک طریقۂ حیات کی حیثیت دینے اور متعارف کرانے کے لیے صوفیاء نے کشادہ ذہنی کے ساتھ اسلام اور دوسرے مذاہب سے استفادہ کیا اور جہاں سے جو چیز مناسب ومعاون نظر آئی اسے اپنا لیا، یہ انتخاب واختیار بہر حال مناسبت ومشابہت اور تقویت ہی کی بنیاد پر کیا گیا۔ ایرانی دانشور ڈاکٹر قاسم غنی کہتے ہیں کہ:-

| | |
|---|---|
| "واقع امر این است کہ تصوف طریقہ مرکب وبلسیار پیچ در پیچ است ومنابع مختلف ومتنوع داشتہ واز سرچشمہائے متعدد آبخوردہ است"[۲] | حقیقت یہ ہے کہ تصوف بہت ہی پیچ در پیچ اور مرکب طریقہ ہے جس کے منابع مختلف اور متنوع ہیں، اور اس نے بہت سے سرچشموں سے سیرابی حاصل کی ہے۔ |

تصوف کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات خاص کا روحانی پیکر کہا جاتا ہے اور بسا اوقات اسے سنتِ رسولؐ کے باطنی پہلو کی حیثیت سے متعارف کرایا جاتا ہے مگر موجودہ نظام تصوف میں سنت رسولؐ کی مکمل پابندی کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا بلکہ اگر یہ کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا کہ بعض حالات میں دریائے تصوف کی موجیں شریعت

---

[۱] ڈاکٹر البرنصری نادر، التصوف الاسلامی ص ۱۲، بیروت۔

[۲] ڈاکٹر قاسم غنی، بحث در افکار واحوال حافظ ۲/۴۴، تہران ۱۳۲۵ھ۔



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی دیواروں سے ٹکرانے لگتی ہیں۔ ایک اجنبی مشاہد کی حیثیت سے ڈاکٹر تارا چند بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ تصوف ایک پیچیدہ نظام حیات ہے وہ اس کی مثال اس دریا سے دیتے ہیں جس میں مختلف ملکوں کی چھوٹی چھوٹی ندیاں آکر ملتی ہیں اور اسے ایک بڑا دریا بنا دیتی ہیں وہ کہتے ہیں کہ :-

"اس کا اصل سرچشمہ قرآن اور پیغمبر اسلامؐ کی زندگی ہے، مسیحیت اور نوافلاطونیت کے دھارے اسی میں آکر ملے اور اس کا حجم بڑھا، ہندومت اور بدھ ازم نے اس کو کئی نئے خیالات دیئے اور قدیم ایرانی مذہب زرتشت اور مانی کے مذاہب نے بھی اسے اپنا حصّہ دیا۔"[۱]

ابتدائے اسلام میں نہ صرف یہ کہ تصوف اور صوفیاء کا وجود نہیں ملتا بلکہ اصحاب صفہ کے اندر بھی ایسی کوئی علامت نہ تھی جو بعد کے صوفیاء کے۔ لیے وجہ جواز فراہم کرے۔ اس وقت دین داری اور تقویٰ کا معیار صحابیت اور بعد کے دور میں تابعیت تھی، دور ملوکیت میں زہاد اور عباد کے القاب معروف ہوئے اور اس کے بعد تصوف اور صوفیاء کی اصطلاح رائج ہوئی۔[۲]

ساسانی عہد کے اواخر اور اسلام کے اوائل میں دجلہ وفرات کے سواحل پر عراق وجزیرہ کے مسیحی رہبان اور نُسّاک ترک دنیا کر کے خانقاہوں کو آباد کر رہے تھے اور شب و روز ریاضت میں مشغول رہتے تھے، وہ نفس کشی اور ترک لذات کے ذریعہ خود کو فنا کرتے، کھردرا اور تکلیف دہ لباس پہنتے تاکہ جسم تکلیف کے خوگر بنیں، ان حضرات کو "صوفی" اور ایسی خواتین کو "صوفیہ" کہا جاتا تھا۔[۳] مسلمانوں میں سب سے پہلے یہ لقب ابو ہاشم کوفی کو ملا جو حضرت سفیان ثوریؒ کے معاصر تھے[۴] حالانکہ فقہا، اس طرز زندگی کو بدعت شمار کرتے تھے چنانچہ خود حضرت سفیان ثوری لباس تصوف پر تنقید کرتے اور اسے بدعت قرار دیتے تھے، حماد بن سلیمان نخعی جب بصرہ آئے تو ان کے سامنے فرقد سنجی لباس تصوف میں آئے تو انھوں نے فرمایا "اس نصرانی لباس کو اتار ڈالو"[۵] مگر یہ طریقے آہستہ آہستہ عراق و

---

۱؎ اسلامی تہذیب کا ہندوستانی سماج پر اثر صنہ ۹ ۲؎ بحث در آثار و افکار و احوال حافظ ۲/۳۷
۳؎ سعید نفیسی، سرچشمہ تصوف در ایران صنہ ۱۴ تہران ۱۹۶۵ء۔
۴؎ دیکھئے شیخ عمر بن محمد شہاب الدین سہروردی کی کتاب عوارف المعارف ۱/۳۵۔ مطبوعہ مصر۔
۵؎ التصوف الاسلامی صنہ ۱۶


© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جزیرہ کے مسلمانوں میں رائج ہوگئے اور شام، مصر اور اندلس میں بھی پھیل گئے اور آخر میں یہ تصوف جب ایران پہونچا تو اس نے ایرانی رنگ و آہنگ اختیار کیا، ایران کے قدیم افکار کے سہارے اس کی تنظیم ہوئی اور مغرب میں نوافلاطونیت حتیٰ کہ اسرائیلیات نے بھی اس راہ کو اختیار کیا اور اس طرح تصوف کی تین شاخیں بن گئیں (۱) عراق کا تصوف نستوری، یعقوبی نصاریٰ اور صابون ابن دیصان، اور ہرمس کی تعلیمات سے متاثر ہوا، (۲) ایران و ہند کا تصوف جو ایران کے زردشت اور مانی، ہندوستان کے بودھ اور اپنشد کی تعلیمات سے متاثر ہوا (۳) مصر و شام اور مغرب و اندلس کا تصوف جو نوافلاطونیت، یہود اور حکما اسکندریہ سے متاثر ہوا[1]۔

ہندوستان سے باہر تصوف کے جو مراکز و مساکن تھے وہاں اسلام سے پہلے دوسری قومی تہذیبیں اور نظریات موجود تھے۔ اس لیے تصوف پر بطور خاص ان کے اثرات پڑے اور جب یہ تصوف مختلف مرحلوں سے گذرتا ہوا ہندوستان آیا تو مسلمانوں میں مقبول عام ہوکر تہذیب اسلامی کا جزو بن گیا۔ شیخ محمد اکرام کہتے ہیں کہ خواجہ باقی باللہ کی آمد سے پہلے تصوف کے جو سلسلے ہندوستان میں برسر فروغ تھے وہ تمام کے تمام ایران اور عراق کی پیداوار تھے، مثلاً قادریہ سلسلہ کے بانی شیخ عبدالقادر جیلانی بغداد کے رہنے والے تھے۔ سہروردی سلسلہ بھی بغداد کے قریب سہرورد گاؤں سے شروع ہوا، چشتیہ سلسلہ بھی خراسان کی ایک بستی چشت کی طرف منسوب ہے۔ ان کے بقول "ان تینوں سلسلوں میں جزوی اور فروعی اختلافات تھے لیکن ان کا روحانی پس منظر ایک تھا، ان سب میں وہ عجمیت جو دور عباسیہ کو دور امویہ سے اور بغداد کے متکلموں اور فلسفیوں کو مدینہ منورہ کے فقہا اور محدثین سے منفرد کرتی ہے موجود تھی، تینوں میں صلح کل کا طریقہ مقبول تھا جس کے تحت غیر مروجہ بلکہ غیر اسلامی طریقوں سے اخذ فیض کرنے میں اجتناب نہ کیا جاتا تھا، تینوں میں شرع کے مقابلے میں تھوڑی بہت آزادی تھی اور تینوں میں وحدت الوجود کا طریقہ رائج ہوگیا تھا[2]۔

مولانا عبید اللہ سندھی تصوف کو اسلام کا ایک حصہ تسلیم کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ "ایرانی مسلمانوں کے پرانے فلسفہ نے عباسیوں کے دور میں رنگ جمانے کے بعد جب

---

[1] سرچشمہ تصوف در ایران ص۲۲۔

[2] محمد اکرام، رود کوثر ص۲۵۹۔



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوبارہ جنم لیا تو اس کا نام تصوف ہوا[1]۔ بلخ و بخارا اور خراسان میں بدھ مت ایک طاقتور مذہب کی حیثیت رکھتا تھا وہاں اس کے بڑے بڑے مراکز موجود تھے اور بدھ کے پیرو بڑی تعداد میں اپنے نظام کے استحکام میں مشغول تھے، جب وہاں تصوف یا صوفیا، کرام پہونچے تو بدھ مت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور بودھ طریقۂ حیات نے نظام تصوف کو نئی جہت عطا کی۔ چنانچہ تصوف کے بہت سے طریقے اور نظریے اسی بدھ مت کی پیداوار ہیں مثلاً حبس دم، صلح کل، تصور شیخ، مریدوں کا سر منڈانا وغیرہ[2]۔

## تصوف کے نظریات

تصوف کے بعض نظریات تو قرآن و سنت پر مبنی ہیں مثلاً صبر، شکر، توکل، زہد، استغنا وغیرہ ان کی تفصیلات میں اختلاف تو ہو سکتا ہے مگر ان اصولوں سے نہیں۔ البتہ تصوف کے بعض نظریات اجنبی ہیں۔ تصوف کے ان نظریات میں بہت سی چیزیں قابل بحث ہو سکتی ہیں مگر ان میں سب سے زیادہ معروف اور نتائج کے اعتبار سے دور رس وحدت الوجود اتحاد اور حلول اور رجال الغیب کے نظریات ہیں جن کے اثرات آج بھی لوگوں کے دل و دماغ پر قائم ہیں۔ وحدت الوجود کا نظریہ، تصوف میں زیادہ معروف ہے اور ہندوستان میں شیخ احمد مہائمی، شیخ عبدالقدوس گنگوہی شیخ تاج العارفین وغیرہ جیسے سیکڑوں بزرگوں نے اس کی وکالت اور اشاعت کی ہے۔ ہندوستان میں چشتیہ اور قادریہ سلسلے بھی وجودی تصوف کے حامی نظر آتے ہیں۔ فیروز شاہ خلجی کے زمانہ میں، احمد بہاری اور شیخ عز کاکوی جو فردوسی سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے نے وجودیت کے سلسلے میں خدائی تک کا دعویٰ کیا اور لوگ ان کے پیچھے ہو لیے چنانچہ علماء کو ان کے قتل کا فتویٰ دینا پڑا[3]۔

سوال یہ ہے کہ تصوف میں اس نظریہ کی آمد کہاں سے ہوئی؟ بعض حضرات نے خود قرآن کی اس آیت "ھو الاول والآخر والظاھر والباطن"[4] کو اس کا سرچشمہ قرار دیا ہے اور بعض

---

[1] شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ ص ۲۰۳، لاہور ۱۹۴۳ء۔

[2] Aziz Ahmad. Studies in Islamic culture in the Indian Environment. P.126, 177, oxford. 1964

[3] فتوحات فیروز شاہی ص ۶

[4] الحدید - ۳

۳۹/۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حضرات نے اسے ہندو مت کے ویدانت سے ماخوذ بتایا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اسلامی دنیا میں اس نظریہ کی ابتدا تیسری صدی ہجری کے آخر یعنی حسین بن منصور حلاج کے زمانے سے ہوئی اور اس کو تقویت اور کمال ساتویں صدی ہجری یعنی محی الدین ابن عربی م ۶۳۸ھ کے عہد میں ملا۔ چنانچہ علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ "اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہندوستان میں آنے کے بعد ہندو ویدانتوں کے تخیل سے مسلمان صوفیوں پر اثر پڑا ہے۔ مگر اسلامی تصوف میں اس تخیل کا اثر بہت پہلے سے معلوم ہوتا ہے۔ خصوصاً جب یہ واقعہ ہے کہ مسلمانوں میں محی الدین ابن عربی ہی سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس عقیدہ کی سب سے پرجوش حمایت کی ہے اور وہ اسپین کے باشندے تھے اور کبھی ہندو فلسفہ سے ان کو دوچار ہونے کا موقع نہیں ملا اس لیے یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ ہندو ویدانت سے نہیں بلکہ نوافلاطونی فلسفہ سے متاثر ہوئے تھے"[1] نوافلاطونیت سے اس نظریہ کا متاثر ہونا بظاہر درست معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ یونانی فلسفہ کا اصول ہے کہ " لا یصدر عن الواحد الا الواحد" یعنی ایک چیز سے صرف ایک ہی چیز کا صدور ہو سکتا ہے۔ بہت سی چیزوں کا نہیں۔ اللہ چونکہ ذات واحد ہے اور مختلف مظاہر اور کائنات کا خالق بھی اللہ ہے، یہ اس اصول سے ٹکراتا ہے اس لیے کہ ایک ذات سے بہت سی چیزوں کا صدور لازم آتا ہے اس "تضاد" کو دور کرنے کے لیے وحدت الوجود کا سہارا لیا گیا جس کی رو سے تمام موجودات ذات واحد کے وجود کے ظہور کی عملی شکل ہے یا یہ کہ وجود حقیقی تو اللہ ہے باقی موجودات اس کا حصہ ہیں۔

اس نظریہ کا منطقی نتیجہ ایک دوسرا نظریہ ہے جسے "اتحاد اور حلول" کہا جاتا ہے یعنی جب ساری مخلوق ایک ہی وجود کا حصہ ہے تو بالآخر اسے اسی ذات میں لوٹ جانا ہے کیونکہ ہر چیز اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے۔ اتصال بالمبدا، فنا فی اللہ، محو و تجرید اور اتحاد اور حلول کے نظریات تمام صوفیہ کے یہاں کسی نہ کسی درجہ میں موجود ہیں۔ ابن خلدون کی نظر میں حلول کا نظریہ صوفیا نے شیعہ حضرات سے لیا ہے۔ ان کے بقول متاخرین صوفیہ چونکہ اسماعیلیوں سے بہت زیادہ ربط و ضبط رکھتے تھے اور اسماعیلی حلول اور الوہیت

---

[1] سید سلیمان ندوی، عرب و ہند کے تعلقات ص ۲۴۷-۲۴۸، اعظم گڑھ ۱۹۷۹ء۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



ائمہ کے قائل تھے اس لیے ابن عربی، ابن سبعین اور ان دونوں کے شاگرد' ابن العفیف' ابن الفارض' اور النجم اسرائیلی بھی اس کے متبع ہو گئے[1] بظاہر ایسا لگتا ہے کہ حلول کا نظریہ زرتشت اور بودھ کی تعلیمات سے ماخوذ ہے یہ ہو سکتا ہے کہ اسماعیلیوں نے بھی زرتشتی عقیدہ سے متاثر ہو کر اسے اپنایا ہو اور وہ صوفیا تک منتقل ہوئے ہوں۔ اتصال بالمبداء، فنا فی اللہ محو و تجرید اور اتحاد و حلول کے اس روحانی ارتقاء کا تذکرہ سب سے پہلے تفصیل کے ساتھ سنائی نے "سیر العباد الی المعاد" میں کیا ہے اس کے بعد عطار نے "منطق الطیر" میں کیا ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ روح چڑیا کی صورت میں سات وادی سے گذرتی ہے اور اس جگہ پہونچتی ہے جہاں اپنے مطلوب کمال کو حاصل کر لیتی ہے۔ دین زرتشت میں بھی سیر و سلوک اور طے مدارج کا بیان روحانی معراج میں ہے جو کہ "ارادی ویراف نامہ" مشہور داستان میں باقی ہے۔ یہی اصول بدھ مت کی تعلیمات میں "نروان" کے نام سے موسوم ہے جس کا نتیجہ فنا ہے[2] بدھ مت اور ویدانت وغیرہ کے اثرات کی بنا پر حلول کا عقیدہ غلو، و تقصیر یعنی یہ کہ انسان خدا کے درجہ تک پہونچ سکتا ہے اور خدا انسان کے درجہ تک اتر سکتا ہے کہ ہندوستان میں قبول کرنے کی بڑی صلاحیت موجود تھی اور شیعوں کے اس اثر نے ہند کے صوفیا کو اسی لیے متاثر کیا ہے[3]

وحدت الوجود کے بطن سے نمودار ہونے والا ایک نظریہ "صلح کل" بھی ہے جو بالآخر وحدت ادیان پر منتہی ہوتا ہے یعنی اگر یہ بات تسلیم کر لی گئی کہ سارے موجودات ایک ہی وجود کا حصہ ہیں، تو ان موجودات میں تمیز، دوئی اور اختلاف روا نہیں، سارے راستے جب ایک ہی منزل کو پہنچتے ہوں تو ان سب کو یکساں، اہمیت ملنی چاہیے جسے ارباب تصوف ع 'ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے، کا عنوان دیتے ہیں۔

تصوف میں ایک معروف تصور مردان غیب کا بھی ہے اس کے مطابق نظام عالم کی اس ظاہری ہیئت کے پس پردہ ایک باطنی نظام ہوتا ہے جس کے چلانے والے مختلف

---

[1] ابن خلدون، مقدمہ ص۴۷۳ فصل تصوف، مکتبہ المثنیٰ بغداد۔

[2] دیکھئے سرچشمہ تصوف در ایران ص۳۶-۳۵۔

[3] اسلامی تہذیب کا ہندوستانی سماج پر اثر ص۷۷۔

۱۴۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



مردانِ غیب ہوتے ہیں۔ ان میں قطب، قیوم، اوتاد، ابدال، مجذوب، نجبا، غوث وغیرہ ہوتے ہیں یہی حضرات دنیا کا نظام چلاتے ہیں اور یہی لوگ حسبِ مرتبہ اللہ کے امر کا نفاذ کرتے ہیں یا اپنا امر اللہ سے نافذ کراتے ہیں۔ بسا اوقات ان کے اختیارات اس قدر ہوتے ہیں کہ اللہ ان کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کرتا، ان کی مرضی اللہ کی مرضی ہوتی ہے اور ان کی ذات اللہ کا مظہر ہوتی ہے۔ قطب عارف کامل کی ترجمانی کرتا ہے۔ صوفیاء کا خیال ہے کہ معرفت میں کوئی شخص قطب کے درجہ تک نہیں پہونچ سکتا جب تک اللہ اسے موت نہ دے[1] جیلی نے انسان کامل کے بارے میں کہا ہے کہ "انسان کامل وہ قطب ہے جس پر اول سے آخر تک وجود کے افلاک گردش کرتے ہیں اور وہ ابتداءِ وجود سے لے کر ابدالآباد تک ایک ہے[2] اوتاد کی تشریح کے لیے حسب ذیل شعر کافی ہے :۔

اگر اوتاد نبود بر روئے زمین نماند پایہ خیمہ ہفتمیں

(اگر روئے زمین پر اوتاد نہ ہوتے تو ساتوں آسمان قائم نہ رہتے)

ابدال کے متعلق یہ واقعہ مشہور ہے کہ غوث الاعظم عبدالقادر جیلانیؒ کی خانقاہ کے دروازہ پر ایک شخص دست و پا شکستہ پڑا تھا اس کے متعلق دریافت کرنے پر حضرت غوثؒ نے فرمایا کہ اس شخص نے بے ادبی کی ہے، ابدالوں میں سے تھا کل اپنے دو رفیقوں کے ساتھ ہوا میں اڑتے ہوئے اس خانقاہ کے اوپر آیا ایک نے ادب سے داہنی جانب کنارہ کیا دوسرے نے بھی اس کی تقلید کی اور بائیں جانب چلا گیا۔ اس شخص نے بے ادبی سے سیدھا جانا چاہا۔ جب ہوا میں خانقاہ کے سامنے آیا تو گر پڑا اور ہاتھ پاؤں ٹوٹ گئے[3] غوث ان تمام کا حاکم ہوتا ہے۔ چنانچہ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ باتفاق تمام صوفیاء کرام غوث تسلیم کئے گئے ہیں۔ چنانچہ جب بھی غوثِ اعظم کہا جاتا ہے تو اس سے مراد حضرت شیخ ہی ہوتے ہیں۔ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ جن خصوصیات کی بنا پر اس عظیم منصب کے مستحق ہوئے اس کی تفصیل شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے بیان

---

[1] ابن خلدون، مقدمہ ص ۴۷۳ ۔

[2] الانسان الکامل ۲/۴۶ مطبوعہ مصر ۱۳۱۶ھ ۔

[3] فوائد الفواد ص ۲-۳ ، لاہور ۱۹۶۶ء ۔



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فرمائی ہے وہ کہتے ہیں کہ:

"آنحضرت (یعنی غوث اعظم) سے بہت سی کرامات منقول ہیں۔ مخلوق کے ظواہر اور بواطن میں تصرف، جن وانس پر حکم جاری کرنا، ضمیروں کے راز سے باخبر ہونا، بھیدوں کا بتا دینا، اور ملک وملکوت کی خفیہ باتوں کی اطلاع دینا، حقائق جبروت اور اسرار لاہوت کو منکشف کرنا، مواہب غیبیہ عطا کرنا اور حوادث وودواہی کی تقلیب وتصریف، اور تصریف اکوان بمحو داثبات الہٰی، مارنے اور جلانے کی صفت سے متصف ہونا، پودے اگانا، کوڑھی اور جذامی کو اچھا کرنا مریضوں کو شفا دینا، زمین وآسمان میں حکم چلانا" وغیرہ۔[1] خود حضرت غوث نے مرض موت میں فرمایا، میرے اور تمہارے، میرے اور تمام مخلوق کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے مجھ کو کسی پر اور کسی کو مجھ پر قیاس مت کرنا میں مخلوق کے امور کا مالک ہوں، میں ان کی عقلوں کا مالک ہوں، اے مشرق ومغرب کے اور اے آسمان کے باشندو! اللہ نے فرمایا ہے" اعلم مالا تعلمون" میں انہی میں ہوں جیسے خدا جانتا ہے تم نہیں جانتے ہو۔[2]"

ہندوستان میں مجددی تصوف میں چار بزرگوں کی قیومیت تسلیم کی گئی ہے، قیوم اول شیخ احمد سرہندی قیوم ثانی خواجہ محمد معصوم قیوم ثالث خواجہ محمد نقشبند قیوم رابع خواجہ محمد زبیر مگر قیوم کیا چیز ہے اس کی تفصیل روضۂ قیومیہ میں اس طرح مذکور ہے کہ قیوم اس شخص کو کہتے ہیں جس کے ماتحت تمام اسماء وصفات شیونات واعتبارات اور اصول ہوں، تمام گذشتہ اور آئندہ مخلوقات کے لیے عالم موجودات وحوش پرند، نباتات، ذی روح، پتھر درخت بحر وبر کی ہر شئے، عرش وکرسی، لوح وقلم، ستارے، ثوابت، سورج، چاند، آسمان، بروج سب اس کے سایہ میں ہوں افلاک وبروج کی حرکت وسکون، سمندروں کی لہروں کی حرکت، درختوں کے پتوں کا ہلنا بارش کے قطروں کا گرنا، پھلوں کا پکنا، پرندوں کا چوں چوں چہچہانا، دن رات کا پیدا ہونا اور گردش کرنے والے آسمان کی موافق رفتار سب کچھ اسی کے حکم سے ہوتا ہے۔ بارش کا ایک قطرہ ایسا نہیں جو اس کی اطلاع کے بغیر گرتا ہو۔ زمین پر حرکت وسکون اس کی مرضی کے بغیر نہیں جو آرام، خوشی اور بے چینی اور رنج اہلِ زمین کو ہوتا ہے اس کے حکم کے بغیر نہیں ہوتا۔ کوئی گھڑی کوئی دن کوئی ہفتہ کوئی

---

[1] عبدالحق محدث دہلوی، اخبار الاخیار ص ۲۳-۲۲ کتب خانہ رحیمیہ دیوبند۔ [2] ایضاً ص ۱۶
۳۴۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



مہینہ کوئی سال ایسا نہیں جو اس کے حکم کے بغیر اپنے آپ میں نیکی و بدی کا تصرف کر سکے۔ غلہ کی پیدائش نباتات کا اگنا غرض جو کچھ بھی خیال میں آسکتا ہے وہ اس کی مرضی اور حکم کے بغیر ظہور میں نہیں آیا۔ روئے زمین پر جس قدر عابد و زاہد، امرا اور مقرب، تسبیح، ذکر و فکر، تقدیس اور تنزیہ میں عبادت گاہوں جھونپڑوں، کٹیوں، پہاڑوں، اور دریا کے کنارے، زبان، قلب، روح، سر خفی، خفی اور نفسی مشاغل اور معتکف ہیں اور اللہ کی راہ میں مشغول ہیں۔ گو انھیں اس بات کا علم نہ ہو جب تک ان کی عبادت قیوم کے یہاں مقبول نہ ہو، اللہ کے یہاں مقبول نہیں ہوتی۔[1]

خواجہ نظام الدین اولیاء سے منقول ہے کہ "جب ولی مقام قطبیت اور غوثیت اور فردیت کو طے کر کے مرتبہ محبوبیت کو پہونچتا ہے تو اس کی ذات مظہر الٰہی ہو جاتی ہے اور اس کا ارادہ بھی ارادۃ اللہ ہو جاتا ہے"۔[2] واضح رہے کہ حضرت نظام الدین اولیاء کا لقب محبوب الٰہی ہے اس کی رو سے وہ اس مقام پر فائز ہیں۔

## تصوف پر تشیع کا اثر

اگر غور سے دیکھا جائے تو تصوف کے یہ نظریے عقیدہ توحید اور اس کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں معلوم ہوتے مگر صوفیاء نے اہل تشیع کے زیر اثر ان کو نہ صرف قبول کیا بلکہ اپنے نظام میں نمایاں حیثیت دے دی۔ تصوف اور تشیع دونوں کا شجرہ حضرت علیؓ پر منتہی ہوتا ہے۔ ہر دو جگہ حضرت علیؓ کو مرکزی ستون کی حیثیت حاصل ہے۔ اگر ایک طرف اہل تشیع اس اعتقاد پر قائم ہیں کہ حضرت علی اللہ کے ولی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی اور ان کے بعد خلیفہ بلا فصل ہیں تو دوسری طرف اہل تصوف اس عقیدہ کے حامل ہیں کہ دوسرے صحابہ کے مقابلہ میں یہ صرف علیؓ کی ذات گرامی ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات باطنی کی حامل ہے۔ جن کو نبیؐ نے بطور خاص خرقہ تصوف سے نوازا تھا۔ چنانچہ میر خورد نے لکھا ہے کہ "حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شب معراج میں اللہ کی جانب سے جو خرقہ فقر کی

---

[1] روضہ قیومیہ ص ۹۴ اردو ترجمہ مولانا کمال الدین محمد احسان، مطبوعہ لاہور۔

[2] سیرت نظامی ص ۱۴۲، بحوالہ آب کوثر ص ۲۷۷۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



خلعت عطا ہوئی تھی آپ نے خلفاء اربعہ میں سے حضرت علیؓ کو اس سے مشرف کیا اور قیامت تک کے لیے یہ سنت مشائخ میں ان کی وجہ سے قائم ہوئی[۱] جنید بغدادیؒ کا مشہور قول ہے "شیخنا فی الاصول والبدا ء علی المرتضی[۲]" اور یہ اس وجہ سے ہے کہ صوفیا کے یہاں محمدؐ اور علیؓ حقیقت کاملہ کے ہی دو روپ ہیں چنانچہ مشہور عارف محمود بن علی کاشانی ۷۳۵ھ فرماتے ہیں کہ:۔

گہ نبی بود و گر گاہے ولی ۔۔۔ گہ محمد گشت و گاہے شد علی

در نبی آدم بیانِ راہ کرد ۔۔۔ در ولی از سرِ حق آگاہ کرد[۳]

(کبھی نبی ہوتا ہے اور کبھی ولی، کبھی محمد ہوتا ہے اور کبھی علی، نبی آدم کی رہنمائی کرتا ہے اور ولی کو رازِ حق سے آگاہ کرتا ہے۔ یہ تصور بھی اہل تشیع کی دین ہے۔ مزید برآں حضرت علیؓ کے فضائل کی جو روایات صوفیا میں معروف ان میں سے بیشتر اہل تشیع کی اختراع ہیں۔

## خضرؑ تصوف میں

رجال غیب کے ضمن میں حضرت خضر کا مقام بھی ممتاز اہمیت کا حامل ہے۔ محدثین کی صراحت کے مطابق خضر وفات پا چکے مگر صوفیاء کے لیے وہ نہ صرف زندہ ہیں بلکہ خاص صوفیاء کی ان سے ملاقات بھی ہوتی ہے[۴] اور وہ خرقہ تصوف بھی پہنایا کرتے ہیں۔
شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے بھی خرقہ طریقت حضرت خضر سے پہنا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ میں خرقہ پوشی کا صوفیاء کی طرح قائل نہ تھا تاوقتیکہ بیت اللہ میں خضرؑ کے ہاتھ سے خود نہ پہن لیا[۵] بلکہ بعض بزرگ تو ایسے ہیں ہیں جن کے متعلق کیا جاتا ہے کہ ان سے خضر سلامتی ایمان کی دعا کراتے ہیں[۶]

---

۱ سید محمد بن مبارک علوی (میر خورد) سیر الاولیاء ص ۱۸، لاہور ۱۹۷۸ء: نیز دیکھئے فوائد الفواد ص ۳۲۹

۲ سیر الاولیاء ص ۱۹ ۔ ۳ ڈاکٹر محسن جہانگیری، محی الدین ابن عربی، حیات و آثار ص ۶۹۔ اردو ترجمہ احمد جاوید و سہیل عمر، لاہور ۱۹۸۹ء ۔ ۴ حمید قلندر، خیر المجالس ص ۷، شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۵۹ء۔

۵ محی الدین ابن عربی ص ۶۹۔

۶ خیر المجالس ص ۱۲-۱۳۔



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



# مراسم تصوف

تصوف میں کچھ رسمیں عبادات سے متعلق ہیں اور کچھ نظام تصوف سے۔ عبادات سے متعلق جو چیزیں حلقۂ صوفیا میں معروف ہیں وہ سب کی سب قرآن وسنت پر مبنی نہیں ہیں بلکہ ان میں سے بعض حضرات صوفیا کی ایجادات میں سے ہیں۔ مثلاً نماز خضر، نماز اویس قرنی، نماز معکوس، نماز فقرا، نماز لیلۃ الرغائب، نماز درازی عمر، نماز طلوع وغروب وغیرہ ان نمازوں کی تفصیل فوائد الفواد، سیر الاولیا اور دیگر کتب تصوف میں موجود ہیں[1] نیز ان نمازوں کا استحباب ثابت کرنے کے لیے صوفیا میں موضوع روایات کا بھی چلن عام رہا ہے[2] یہاں ان مراسم کا تذکرہ مناسب ہے جو نظام تصوف کو متعارف کراتے ہیں۔ ان میں پیر، مرید اور بیعت کے مراسم زیادہ اہم ہیں۔ پیر کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ پیغمبر کے قائم مقام ہوتا ہے جیسا کہ مشہور ہے کہ الشیخ فی قومہ کالنبی فی امتہ[3] شیخ کا مقام اپنی قوم میں اسی طرح ہے جس طرح نبی کا مقام اپنی امت میں۔ بغیر نبوت کے ایمان کا اعتبار نہیں بغیر شیخ کے ہدایت کا تصور نہیں۔ چنانچہ ابو یزید بسطامی کا مشہور قول ہے جو بعض اوقات حدیث کی حیثیت سے بھی پیش کیا گیا ہے "من لیس لہ شیخ فشیخہ ابلیس"[4] جس کا کوئی شیخ نہ ہو اس کا شیخ ابلیس ہوتا ہے۔ صرف شیخ ہی کی رہنمائی انسان کو منزل مقصود تک پہونچا سکتی ہے اسی لیے کہا گیا ہے کہ مرید کے دل میں پیر کی محبت اور اعتقاد اس حد تک ہونا چاہیے کہ وہ یہ سمجھے کہ اس زمانہ میں اس کے علاوہ اور کوئی اسے خدا تک نہیں پہونچا سکتا، اگر کمزور اعتقاد مرید کے دل میں یہ خیال آجائے کہ پیر کے علاوہ بھی کوئی خدا تک پہونچا سکتا ہے تو یقینی طور پر شیطان نے اس کے اعتقاد میں خلل اندازی کی ہے[5] اسی لیے شیخ کا ہر حکم ماننا خواہ وہ خلاف شرع ہی کیوں نہ نظر آئے ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ حافظ کا مشہور شعر ہے:۔

---

[1] فوائد الفواد ص ۳۴، ص ۲۲۷، سیر الاولیا ص ۳۹۸

[2] اللآلی المصنوعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ ص ۷۔ [3] سیر الاولیا ص ۳۷

[4] خیر المجالس ص ۴۸، نیز دیکھئے فوائد الفواد ص ۲۹۲۔

[5] سیر الاولیا ص ۳۴۵۔



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید    کہ سالک بے خبر نبود زراہ و رسم منزلہا

(اگر پیر مغاں کہے تو سجادہ کو شراب سے رنگین کر دو، کیوں کہ سالک منزل کی رسم و راہ سے بے خبر نہیں ہوتا) مرید سے اسی اعتقاد ہمہ اوست کا امتحان لینے کے لیے بسا اوقات پیر اس سے اپنے کو رسول کہلواتا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت شبلی کی خدمت میں ایک شخص مرید ہونے کے لیے حاضر ہوا، شیخ نے فرمایا میں ایک شرط پر تجھکو مرید کرتا ہوں کہ میں جو کہوں تو اسے بجالائے، اس نے قبول کیا۔ شیخ نے فرمایا کلمہ کس طرح پڑھتے ہو؟ اس نے کہا "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" شیخ نے فرمایا اس طرح پڑھو "لا الٰہ الا اللہ شبلی رسول اللہ" وہ شخص راسخ العقیدہ تھا فوراً پڑھنے لگا۔ اس پر شبلی نے کہا کہ صرف تیری عقیدت کو جانچنے کے لیے کہا تھا ورنہ میں تو رسول اللہ کے کمترین غلاموں میں سے ہوں[1]۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ کے بارے میں بھی منقول ہے کہ انھوں نے ایک نووارد کا امتحان لینے کے لیے "لا الٰہ الا اللہ چشتی رسول اللہ" کہلوا کر بیعت کیا تھا[2]۔ ذوالنون مصری کا قول ہے کہ:۔

ہرگز مرید نہ بود تا استاذ خود را فرمان برندہ تر نبود از خدائی[3]

کوئی شخص ہرگز مرید نہیں ہو سکتا جب تک خدا سے زیادہ اپنے استاذ (پیر) کا فرماں بردار نہ ہو جائے۔

## سجدۂ تعظیمی

پیر کا یہی وہ بلند و برتر مقام ہوتا ہے جس کی وجہ سے صوفیاء نے اپنے لیے سجدہ تعظیمی کو روا رکھا ہے، چنانچہ نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا "بہت سے آدمی میرے پاس آتے ہیں اور سجدہ تعظیم کرتے ہیں، زمین پر سر رکھتے ہیں۔ یہ امر شیخ الاسلام فرید الدین اور حضرت بختیار کاکیؒ کے سامنے بھی ہوتا تھا اور آپ اس کو روا رکھتے تھے پس میں بھی کچھ نہیں کہتا، اس وقت فوائد الفواد کے مرتب امیر حسن علا سنجری نے عرض کیا جو شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور بغایت تعظیم سے سر زمین پر رکھتا ہے اس میں اس کو مزید حاصل ہوتا ہے کہ نفس اس کا ٹوٹتا ہے۔ کیونکہ مخدوم کو اللہ نے یہ شرف بخشا ہے کہ جس طرح اللہ کی عظمت

---

[1] فوائد الفواد ص ۳۹۲ [2] فوائد السالکین ص ۲۳ ، اردو ترجمہ، مکتبہ جام نور، نئی دہلی

[3] فرید الدین عطار، تذکرۃ الاولیاء ۱/۱۳۱ مطبع بریل لیڈن ۱۹۰۵ء



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



اور جلال بلند ہے، اور حق بجا آوری، احسانات و شکرگزاری ادا نہیں ہوسکتی اسی طرح آپ کی تعظیم بھی کامل نہیں ہوسکتی[۱] بلکہ بعض صوفیاء نے تو بادشاہوں کو سجدہ تعظیمی کا مستحق بنا دیا ہے۔ بادشاہ اکبر کو دین سے بیزار کرنے میں صوفیاء نے جو کردار ادا کیا بدایونی نے تفصیل سے اس پر گفتگو کی ہے بدایونی تاج الدین ولد زکریا اجودھنی جو کئی کتابوں کے مصنف تھے، ممتاز صوفی تھے اور تاج العارفین کہلاتے تھے کے متعلق کہتا ہے کہ انھوں نے خلیفۃ الزماں کو انسان کامل کہا اور اکبر کو اس لقب کا مستحق قرار دیا اور اس کے لیے سجدہ تجویز کیا جس کا نام زمین بوس رکھا اس کی تائید میں بعض روایات اور ان ہندوستانی صوفیانہ طریقوں کی مثال دی جن میں مرید اپنے مرشدوں کو سجدہ تعظیمی کرتے ہیں[۲]۔

## پیر کی دستگیری بعد وفات

پیر کی رہنمائی اور کاملیت کے پیش نظر اس کی وفات کے بعد بھی اس کے کپڑوں سے تجدید بیعت کی جاتی ہے۔ چنانچہ نظام الدین اولیاءؒ سے منقول ہے کہ "اگر مرید تجدید بیعت کرنا چاہے اور شیخ موجود نہ ہو تو جامہائے شیخ اپنے سامنے رکھے اور ان سے بیعت کرے۔ حضرت شیخ الاسلام بسا اوقات ایسا ہی کرتے تھے اور میں بھی ایسا ہی کرتا ہوں[۳]۔"

پیر اپنی زندگی میں ہی مرید کا رہنما فیض رساں اور دستگیر نہیں ہوتا بلکہ مرنے کے بعد بھی اسے فیض پہونچاتا ہے اور تصرفات پر قدرت رکھتا ہے، چنانچہ مشہور ہے کہ خواجہ عثمان ہارونی کے ایک مرید کا جب انتقال ہوگیا اور فرشتوں نے اسے عذاب دینا چاہا تو شیخ مانع ہوئے فرشتوں نے خدا کے حکم سے کہا یہ آپ کے راستے سے ہٹا ہوا تھا، شیخ نے کہا یہ درست ہے لیکن تھا تو میرا مرید، چنانچہ فرشتوں کو حکم ہوا کہ شیخ کے مرید سے تعرض نہ کریں[۴]۔ اسی لیے مرید شیخ کے نام کی قسمیں کھاتا ہے اور اس کے نام کا ورد کرتا ہے چنانچہ شیخ نظام الدین اولیاء شروع میں ہر نماز کے بعد دس بار شیخ فرید اور دس بار مولانا فرید کہتے تھے اور ان کے نام کی قسم کھاتے تھے[۵]۔

---

[۱] فوائد الفواد ص ۲۶۹، ص ۲۶۸ [۲] عبد القادر بدایونی منتخب التواریخ ۲/۲۵۸ - کلکتہ ۱۸۶۹ء

[۳] فوائد الفواد ص ۹۹ [۴] سیر الاولیاء ص ۵۵ [۵] فوائد الفواد ص ۲۵۳

۸۴۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



## قبر پرستی

شاید اسی بنا پر شیخ کی قبر کی زیارت کرنا، شیخ کے واسطہ سے دعا مانگنا اہل تصوف میں بہت رائج رہا ہے، چنانچہ شاہی موئے تاب اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میری وفات کے بعد جس شخص کو کوئی مشکل آئے اس کو لازم ہے کہ مسلسل تین دن تک میری زیارت کو آئے انشاء اللہ اس کی مراد پوری ہوگی اگر نہ ہو تو چوتھے دن پھر آئے، ضرور حاجت پوری ہوگی اگر بالفرض پوری نہ ہو تو پانچویں روز آکر میری قبر کی اینٹ سے اینٹ بجا دے[۱] اسی طرح شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا جب بھی اللہ سے کوئی چیز مانگو تو میرے وسیلہ سے مانگو، تاکہ مراد پوری ہو، جو کسی مصیبت میں میرے وسیلہ سے امداد چاہے تو اس کی مصیبت دور ہو جو کسی سختی میں میرا نام لے کر پکارے اسے کشادگی حاصل ہو[۲] مزید فرمایا کہ میں قیامت تک اپنے مریدوں کی دستگیری کرتا رہوں گا اگرچہ وہ سواری کرے[۳] شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے بارے میں گلزار ابرار کے مصنف لکھتے ہیں کہ جب بادشاہ وقت نے ان کو دہلی سے ہٹ جانے پر مجبور کر دیا تو وہ نارنول پہونچے اور شیخ محمد ترک نارنولی کے روضہ پر آئے اور شیخ محمد کی قبر کی طرف منہ کر کے مراقب ہوئے۔ جب سر اٹھایا تو فرمایا جس کسی کو دشواری پیش آئے اس کو چاہیے کہ وہ جبین نیاز ان حضرت کی خاک پر رگڑے اور اپنی مشکل کی آسانی چاہے[۴] شیخ نظام الدین اولیاء کہتے ہیں کہ "مجھے جو ضرورت پیش آتی ہے اسے والدہ کی قبر کے سامنے پیش کرتا ہوں اکثر ایک ہفتہ میں ضرورت پوری ہو جاتی ہے، ایسا کم ہوتا ہے کہ ایک مہینہ لگ جائے[۵]

شیخ کی انہی خدائی صفات کی بنا پر صوفیا اکرام حج بیت اللہ پر شیخ کی قبروں کی زیارت کو ترجیح دیتے تھے۔ فوائد الفواد کے مرتب امیر حسن علا سجزی نے شیخ نظام الدین اولیاء کے سامنے اپنے دوست ملیح کا یہ جملہ نقل کیا کہ حج کو وہ شخص جائے جس کا کوئی پیر نہ ہو۔ اس کے جواب میں شیخ نے فرمایا ع آں رہ بسوی کعبہ بردو ایں بسوی دوست[۶]

---

[۱] ایضاً ص ۱۵۹ [۲] اخبار الاخیار ص ۲۶-۲۵ [۳] ایضاً ص ۲۵ [۴] محمد غوثی شطاری، گلزار ابرار، اردو ترجمہ فضل احمد جیوری ص ۶۹، لاہور ۱۳۹۵ھ [۵] فوائد الفواد ص ۱۱۲ [۶] فوائد الفواد ص ۲۶۳



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



مزید فرمایا کہ شیخ فریدالدین کے انتقال کے بعد مجھ کو ادائے حج کا اشتیاق بہت ہوا، میں نے اپنے دل میں ارادہ کیا کہ اجودھن سے واپس آکر حج کو جاؤں گا الغرض اجودھن سے حضرت شیخ الاسلام کے مزار کی زیارت کو گیا وہاں مجھے میرا مقصود شی زائد کے ساتھ مل گیا، اس کے بعد پھر ایک مرتبہ خانہ کعبہ کی زیارت کی نیت ہوئی اس مرتبہ بھی اجودھن حضرت شیخ کے روضہ مبارکہ کی زیارت کو گیا اور غرض مذکور مجھ کو حاصل ہو گیا[1] ہندی مسلمانوں پر اس تصوف کا یہ اثر مرتب ہوا کہ مسجد کے بجائے مزارات اور آستانے زیارت گاہ بن گئے، عوام بالخصوص جاہل طبقہ ان قبروں کو حاجت روائی کا مرکز اور ان کے مکینوں کو حاجت روا مشکل کشا سمجھنے لگا وہاں کی حاضری عبادت سے زیادہ اہم قرار پائی، اولاد کی طلب، نوکری کی غرض، کشائش رزق کی ضرورت اور دنیوی مرادوں کی تکمیل کے لیے قبروں کی زیارت اور ان پر نیاز چڑھانے اور وہاں سر جھکانے کی وبا عام ہو گئی اس کے لیے مزارات پختہ اور مزین ہونے لگے اور ایک ایسا کلچر وجود میں آگیا جسے مزاری کلچر کا نام دیا جا سکتا ہے اور یہی کلچر ہندو پاک بنگلہ دیش اور ترک و ایران کے جاہل عوام کا آئینہ حیات ہے۔

## طریقت اور شریعت

اسلام میں ظاہر و باطن اور شریعت و طریقت کی کوئی تقسیم نہیں۔ اسلام کے نظامِ تربیت میں نفس کا تزکیہ اور شرعی احکام کی پابندی ایک ہی حقیقت کے پہلو ہیں۔ قرآن و حدیث کی تعلیمات میں دونوں پر یکساں زور دیا گیا ہے اور کہیں بھی اس قسم کی تفریق ظاہر و باطن میں نہیں کی گئی، بلکہ ایک مومن کامل بموجب فرمان رسولؐ رات کا راہب اور دن کا مجاہد ہوتا ہے[2]۔ مگر صوفیا کرام نے طریقت کے نام پر دین کی ایسی آبجو نکالی جو شریعت سے الگ اور متبادل سی چیز بن گئی اور ممتاز حیثیت کی حامل قرار پائی طریقت نے اپنے بال و پر اس طرح پھیلائے کہ شرعی احکام سے بے نیازی عام ہو گئی بلکہ اسے "اہلِ ظاہر" کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ ایسی مثالیں بھی اہلِ تصوف میں مل جاتی ہیں کہ

---

[1] ایضاً

[2] مسلم ۴۵۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



دینی فرائض کو جن کا ترک کرنا کفر قرار دیا گیا ہے انجام نہیں دیتے۔ چنانچہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے ایک شریک مجلس نے پوچھا کہ بعض اولیا، کو اللہ کے ساتھ اتنی مشغولیت ہوگئی کہ وہ نماز بھی نہ ادا کر سکے، اس کے جواب میں شیخ نے فرمایا یہ حضرات مقتدا نہیں ہیں۔ اقتدا کے لیے شریعت کی رعایت واجب ہے[1]، اہلِ طریقت نے شریعت کے ان مظاہر کو بھی نشانہ بنایا جو اسلام کے تعارف کا ذریعہ ہیں، چنانچہ امیر خسروؒ، عرفی شیرازی اور شاہ ہمدانی کے بعض اشعار سے اس کا ثبوت ملتا ہے[2]۔ شیخ احمد سرہندی نے ایک مکتوب کے جواب میں لکھا تھا "آپ نے تمہیدات عین القضاۃ (ہمدانی) کی عبارت کے معنی پوچھے ہیں اس میں لکھا ہے کہ تم جس کو خدا جانتے ہو وہ ہمارے نزدیک محمد ہے اور جس کو تم محمد جانتے ہو وہ ہمارے نزدیک خدا ہے۔ میرے مخدوم! اس قسم کی عبارتیں جو توحید و الحاد کی خبر دیتی ہیں سکر کے غلبوں میں جو مرتبہ جمع ہے اور جسے کفر طریقت سے تعبیر کرتے ہیں مشائخ سے بہت صادر ہوتی ہیں۔ اس وقت دوئی اور تمیز ان کی نظر سے دور ہو جاتی ہے[3]۔ سترہویں صدی میں ایک بزرگ حاجی لگن شورہانی قصوری نے سات حج کیے انشراح قلب کے لیے مختلف اولیاء کے پاس پہونچے مگر میسر نہ ہوا ساتویں حج میں اشارہ ہوا کہ تمہاری مشکلات کا حل شیخ عیسیٰ مشواقی کے پاس ہے۔ وہ ملامتیہ طریقہ سے وابستہ تھے اکثر شراب کے نشہ میں رہتے۔ حاجی لگن نے ان کا طریقہ اختیار کر لیا زہد و تقویٰ اور شریعت کی پابندی کو خیر باد کہدیا چار آبرو کا صفایا کیا اور ہر وقت آگ روشن رکھنے لگے، لباس میں صرف ستر عورت پر اکتفا کرتے نقشبندیہ سلسلہ میں شریعت کو طریقت پر فوقیت دی گئی اور کشف و الہام وجد و حال کو

---

[1] خیر المجالس ص ۲۶

[2] امیر خسرو کہتے ہیں۔ کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست    ہر رگ ما تار گشتہ حاجت زنار نیست

عرفی کہتے ہیں۔ چناں با نیک و بد عرفی بسر کن کز پس مردن    مسلمانت بزمزم شوید و ہندو بسوزاند

ملا شاہ قادری کہتے ہیں۔ پنجہ در پنجہ خدا دارم    من چہ پروائے مصطفےٰ دارم

شیخ سرہندی نے کہا تھا۔ اے دریغا کیں شریعت ملت آبائی است    ملت ما کافری و ملت ترسائی است

کفر و ایماں ہر دو زلف و روئے آں زیبائی است    کفر و ایماں ہر دو اندر راہ ما یکتائی است

[3] مکتوبات امام ربانی۔



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



کتاب وسنت کی کسوٹی پر رکھنے کا رجحان پیدا کرنے کی کوشش کی گئی[۱] تاہم عجمی تصوف کے مجموعی اثرات سے اس سلسلہ کو بھی متاثر ہونا پڑا اور اس کی مثال نظریہ قیومیت ہے۔

سوال یہ ہے کہ طریقت کی راہ اختیار کرنے والوں میں شریعت سے گریز کا رجحان کیونکر پیدا ہوا؟ اصل بات یہ ہے کہ ہندوستانی تصوف جو ایرانی اور عراقی تصوف کا شرمندۂ احسان ہے، اس سلسلہ میں بھی ایرانی تصوف کا پابند ہے، ایرانی تصوف کی اپنی کچھ خصوصیات ہیں جن میں ایک نمایاں وصف یہ ہے کہ ابتدائی عہد میں صرف طریقت ہی تصوف کا طریقہ عمل تھا، وہاں شریعت اور احکام سے تعرض نہیں ملتا۔ چنانچہ صوفیاء ایران نے ابتداء میں تصوف پر جو کتابیں لکھی ہیں ان میں فرائض اور عبادات اور شریعت کے معروف مباحث شامل نہیں ہیں ان کتابوں کے ابواب اور فصول سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان حضرات نے پانچویں صدی ہجری تک تصوف میں طریقت کے ساتھ شریعت کو نہیں جوڑا تھا، ان کی نظر میں شریعت اور طریقت دو مختلف چیزیں تھیں[۲]

اس اتحاد و اتصال کے باوجود صوفیاء حضرات کے یہاں طریقت کچھ زیادہ اہمیت کی حامل رہی اور ارباب طریقت اپنے آپ کو اہلِ شریعت کے مقابلہ میں امتیاز و فضیلت کے حق دار سمجھتے رہے۔ بلکہ اس باب میں وہ ائمہ امت اور اساطین فقہ کو بھی فروتر گردانتے ہیں چنانچہ بعض صوفیاء برملا کہتے ہیں کہ

بوحنیفہ زعشق درس نگفت | شافعی را در وحکایت نیست
حنبل از عشق نیز بے خبراست | مالکے را در روایت نیست

امام ابوحنیفہ نے عشق کا درس نہیں دیا، امام شافعی کی عشق کے باب میں کوئی حکایت

---

[۱] دیکھئے مکتوبات امام ربانی دفتر اول خط بنام مرزا حسام الدین۔

[۲] تفصیل کے لیے دیکھئے سرچشمہ تصوف در ایران، باب طریقت و شریعت، مصنف نے ابونصر عبداللہ طوسی م ۳۷۸ھ کی کتاب اللمع، ابوبکر محمد بن اسحاق بخاری، ۳۸۰ھ کی کتاب التعرف لمذہب اہل التصوف ابوالحسن علی بن عثمان ہجویری، ۴۶۴ھ کی کشف المحجوب، ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن ۴۶۵ھ کی رسالۃ القشیریۃ اور خواجہ عبداللہ انصاری م ۴۸۱ھ کی منازل السائرین اور صد میدان کے ابواب و فصول کو بطور مثال پیش کیا ہے۔ مصنف سعید نفسی کا یہ بھی کہنا ہے کہ امام غزالی م ۵۰۵ھ پہلے شخص ہیں جنھوں نے شریعت اور طریقت کو جمع کیا ہے۔ یہی خیال ابن خلدون کا بھی ہے۔ دیکھئے مقدمہ ص ۴۶۹۔



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



نہیں ہے، امام احمد بن حنبل عشق سے بے خبر ہیں امام مالک کی اس سے متعلق کوئی روایت نہیں ہے۔

## اصلاح معاشرہ اور تصوف

نظام تصوف میں تزکیہ نفوس اور اصلاح احوال کا مخصوص مقام ہے اور کہنا چاہیے کہ موثر طریقہ کار یہ ہے کہ جو شخص اپنی اصلاح کے لیے فکرمند ہے وہ کسی اہلِ دل کے ہاتھ پر بیعت کرے یا کسی خانقاہ کی حاضری اور اہلِ طریقت پر اعتقاد کو لازم پکڑ لے، اس طرح کہ وہ اپنی کمزوریاں شیخ کے سامنے پیش کرتا رہے اور ان کی اصلاح ہوتی رہے۔ رہا عوام کا وہ بڑا طبقہ جو دین کی تعلیم سے محروم دینی عمل سے غافل اور مفکرات کا اسیر ہے اور اس کی توجہ بھی اصلاح طلبی کی طرف نہیں تو تصوف میں اس کی اصلاح کی ضرورت نہیں محسوس کی جاتی، یہ علماء اور واعظین کا تو کام ہو سکتا ہے جو اپنی تقریر، وعظ اور تبلیغ کے ذریعہ اس کام کو انجام دیتے ہیں مگر صوفیاء اسے اپنے دائرہ کار سے خارج سمجھتے ہیں، صوفیاء اس شخص یا اس گروہ کی اصلاح کے ذمہ دار تھے جو ان کے ساتھ اعتقاد رکھتا ہو اور اپنی اصلاح کے لیے اس حد تک فکرمند ہو کہ ان کی خانقاہ تک آنے کے لیے تیار ہو، دوسرے لوگ خواہ وہ منکرات اور مفاسد میں کہیں تک بھی گرفتار ہوں بہر حال ان کی اصلاح کی ذمہ داری ان پر عائد نہیں ہوتی چنانچہ شیخ کلیم اللہ دہلوی نے اپنے خلیفہ اعظم شیخ نظام الدین اولیاؒ، اورنگ آبادی کو تحریر فرمایا کہ "صلح با ہندو و مسلمان سازند ہر کہ ازیں دو فرقہ کہ اعتقاد بشما داشتہ باشد ذکر و فکر و مراقبہ و تعلیم او رابگویند کہ ذکر بخاصیت خود اورا بطریقہ اسلام خواہد کشید و با غیر معتقد اگرچہ سید زادہ باشد تعلیم نہ باید کرد"[1] اس نقطۂ نظر کو اختیار کر لینے کے بعد سماج کی معمولی اصلاح میں عملی حصہ لینا ایک غیر متعلق سی بات تھی۔ ڈاکٹر محمد اشرف کا کہنا ہے کہ "عام طور پر صوفیا کا عوام کے ساتھ تعلق اتنا سہی تھا کہ عوامی زندگی اور ان کی روحانی ضروریات سے ان کا رشتہ کم و بیش بے تعلق معلوم ہوتا ہے۔ وہ مسلمانوں کی تقلید پسندی کی زندگی سے غیر مطمئن تھے لیکن ان علماء کی طاقت کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتے

---

[1] مکتوبات کلیم اللہ ص ۸۶



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



تھے جو عوام کی رہنمائی کرتے تھے اور اسلامی عقائد کی بے لوث ترجمانی کا سہارا لے رہے تھے، اس طرح وہ مسلم امرا کی زندگی کو بھی ناپسند کرتے تھے لیکن وہ برسر اقتدار طبقہ کی طاقت سے اس حد تک خوفزدہ تھے کہ نہ ان سے شدید اختلاف کر سکتے تھے اور نہ ان پر ایماندارانہ تنقید کر سکتے تھے[۱]

تیرہویں اور چودھویں صدی عیسوی ہندوستان میں تصوف کا عہد زریں شمار کیا جاتا ہے ان دو صدیوں میں بیشمار صوفیا اور مشائخ گذرے ہیں۔ خواجہ معین الدین چشتی سے لے کر نظام الدین اولیاؒ اور نصیر الدین چراغ دہلی تمام اجلہ صوفیا، انہی صدیوں میں رونق افروز تھے۔ مگر ان صدیوں میں عوامی زندگی شدید اخلاقی بحران کا شکار تھی اسلام کی نظر میں وہ برائیاں جو قومی اور دینی زندگی کے لیے مہلک ہوتی ہیں ہندوستان معاشرہ میں رائج تھیں مگر بقول ایک ہندوستانی مبصر کے "عظیم سماجی مصلحتیں جیسے نانک اور صوفیا، دبیشوا جیسے کبیر چشتی یا نظام الدین اولیا دان سماجی برائیوں پر اپنی رائے ظاہر کیے بغیر گذر جاتے ہیں۔ اگرچہ انھوں نے غیر معمولی جوش کے ساتھ مذہبی چودھراہٹ کی مخالفت کی ہے لیکن اس مجاہدانہ اور نمایاں طریقہ پر ان اہم برائیوں کے خلاف جدوجہد نہیں کرتے[۲] اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ صوفیاء کے نزدیک مخلوق سے کم آمیزی درویشی کا بنیادی اصول ہے۔ وہ مخلوق سے ملنے جلنے کو زہر قاتل سمجھتے ہیں چنانچہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی فرماتے ہیں "ایسے درویش! جب تک تو کم نہ بولے گا اور لوگوں سے میل جول کم نہ کرے گا درویشی کا جوہر ہرگز تجھ میں پیدا نہ ہوگا، کیونکہ درویش لوگوں کا وہ گروہ ہے جس نے اپنے لیے نیند حرام کی ہے اور بات کرنے میں زبان گونگی بنالی ہے، عمدہ کھانے کو مٹی میں ملادیا ہے اور لوگوں کی صحبت کو زہریلے سانپ کی طرح خیال کیا ہے[۳]" ظاہر ہے کہ جب مخلوق سے آمیزش اصول تصوف

---

[۱] K. M. Ashraf. Life and Condition of the people of Hindustan P. 20, Delhi, 1970

[۲] ایضاً ص۲۳ ۔

[۳] فوائد السالکین ص۳۴ ملفوظات خواجہ قطب الدین بختیار کاکی ۔



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com


کے منافی ہو تو مخلوق کی اصلاح کا بس ایک ہی طریقہ رہ جاتا ہے کہ لوگ خود اپنے گناہوں کو محسوس کریں اور توبہ کی نیت کر کے صوفیاء کا قصد کریں۔

رفتہ رفتہ تصوف لوگوں کی اصلاح کرنے کے بجائے خود قابل اصلاح بن گیا۔ بدعات وخرافات تصوف کی شناخت کا ذریعہ بن گئیں۔ سلسلہ تصوف کے حامی ڈاکٹر خلیق احمد نظامی کہتے ہیں کہ "چودہویں صدی کے نصف آخر میں تصوف نے ہندوستان میں نہایت ہی بدنما شکل اختیار کر لی تھی اور صدہا مخرب اخلاق رسمیں اور گمراہ کن بدعات عام ہو گئی تھیں، ایک بڑی گمراہی یہ تھی کہ عورتیں کثیر تعداد میں مزارات پر جاتی تھیں اور شہر کے لونڈے اور اوباش مردان کے پیچھے ہو لیتے تھے اور مزارات پر طرح طرح کی حیا سوز حرکتیں ظہور میں آتی تھیں[1]"

اٹھارہویں صدی عیسوی تک پہونچتے پہونچتے تصوف، الحاد و گمراہی، فاسد رسوم محرمات، بداخلاقی اوہام پرستی اور نفس پرستی کا مجموعہ بن چکا تھا، ہر چند کہ ایسے صوفیا بھی رہے جو مذکورہ برائیوں سے پاک تھے مگر ان کی تعداد کم تھی، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی م ۱۱۷۶ھ نے اپنے عہد کے گمراہ صوفیاء کو آٹھ گروہوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر گروہ کے غلط کردار پر روشنی ڈالی ہے[2] انھوں نے مسلمانوں کو جو مشورہ دیا ہے وہ نہایت معنی خیز ہے کہ "اس دور کے مشائخ کے ہاتھ پر ہرگز بیعت نہیں کرنی چاہیے اور غلو عام سے دھوکا نہ کھانا چاہیے اور نہ کرامت سے دھوکا کھانا چاہیے۔ اس لیے کہ اکثر عوام کا تعلق غلو رسم کی وجہ سے ہے اور رسمی امور کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا"[3]

---

[1] سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ص ۴۲۸۔

[2] التفہیمات الالہیہ ۱/۱۱۳، مجلس علمی ڈابھیل۔

[3] المقالۃ الوضیۃ فی النصیحۃ والوصیۃ، التفہیمات الالہیہ ۱/۱۱۴۔



© rasailojaraid.com